چلو پھر لوٹ جاتے ہیں

مجموعۂ کلام

سیّد عقیل شاہ

چلو پھر لَوٹ جاتے ہیں

مجموعۂ کلام

سید عقیل شاہ



نامِ کتاب : چلو پھر لوٹ جاتے ہیں

مصنف : سید عقیل شاہ

صنف : شاعری نظم وغزل

اشاعتِ اول: جون ۲۰۱۰

تعدادِ اشاعت: ۵۰۰

قیمت : ۲۵۰ روپے

کمپوزنگ : الخطاط کمپیوٹرز

مصنف سے رابطہ : 03013057203

ناشر

الخطاط پبلشر جوہر کالونی سرگودھا پاکستان

ابتدائے سخن

زندگی کیا ہے! اِک عجیب سا فلسفہ۔ تمام تر مشاہدات و تجربات کے باوجود انسان خواہ وہ کسی بھی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتا ہو ایک ہی مقام پہ کھڑا ہے اور سوچ میں گم ہے کہ زندگی کیا ہے! مجھے بھی کبھی کبھی جب افکارِ زندگی کی تلخیوں سے تھوڑی سی رہائی مل جاتی ہے تو اِسی اِک سوال کے تعاقب میں سوچ کے جنگل میں اُتر جاتا ہوں رستوں کو عبور کرتے کرتے ساگر کی لہروں پہ تیر کر یا ڈوب کر نہ جانے کن سنگلاخ چٹانوں سے گزر جاتا ہوں، سمندر کی تہ اِلفاظ کی سیپیاں اُٹھا لیتا ہوں جن سے نکالے گئے انمول موتیوں کے عوض مجھے اِتنا موقع دیا جاتا ہے کہ میں لمحات کو محفوظ کر سکوں۔ جن کے عوض مجھے اِتنا استحکام بخشا جاتا ہے کہ میں تیز ہواؤں کے پہلو میں اپنے لیے اِک دیپ جلا سکوں جسے دیکھ کر لوگ میری موجودگی کا احساس پائیں یہی میرا رختِ سفر ہے۔ اور یہی حاصلِ جاں وقت گزاری کا سامان بھی اور زندگی کے کٹھن مراحل میں ہمراہی بھی مگر جوابات کم ہیں اور سوالات زیادہ ہیں۔ مجھے بھی اِک جواب کی تلاش ہے جس کی کھوج میں درپیش اِک اور سوال ہے اور پھر سوالات کا اِک ایسا اُلجھاؤ ہے کہ جس کے حصار میں گم ہو کر میں پہلے سوال کو بھول جاتا ہوں اور نئے سوال کے جواب میں نکل پڑتا ہوں بحر حال مجھے اِک جواب کی تلاش ہے کہ جس کا سوال میں کب کا بھول بھی چکا۔ اَب کوئی مجھے دیوانہ کہے یا بے سمت مسافر مگر کچھ تو ہے جس کو اُس کے اصلی نام سے کوئی نہ جان سکا بس اُس کے متبادل نام رکھ دیے گئے اَب جس کی مرضی جو نام رکھے۔ میں نے خود کلامی میں منعکس ہو کر لوٹنے والی اپنی ہی آواز سے سنا کہ زندگی کم ہے اور سوالات زیادہ ہیں اور جواب ایسے ہے جیسے کسی پُر اسرار پہاڑ پہ کھلنے والا اِک گلاب جو کہ سال میں ایک دفعہ کسی چاندنی رات میں پلک جھپکتے ہی کھلے اور اُسی لمحے میں غائب ہو جائے اَب میں کیونکر پورا سال کسی ایسے لمحے کی تلاش میں رہوں جو مجھ سے میلوں کے فاصلے سے ہو کر گزر جائے اور

مجھے خبر تک نہ ہو لیکن کبھی میں نے اِس گلاب کو خواہش کا نام دیا ہے جو کہ دُنیا کی ناپائیداریوں میں اپنی روح اور جسم کی تکمیل میں بھٹک رہی ہے اور بے جسم و روح بھٹکنا کیا ہے! نہ ہونا اور نہ ہونے کا احساس کیا ہے! اِک زہر ہے جس کے درد میں اذیتیں یوں نوچتی ہیں جیسے جنگلی درندے بے یارومددگار ہرن کو۔ مگر کہانی ختم نہیں ہوتی۔ ہے تو اِک سانس کا جھگڑا اور پھر کرب میں کیسی راحت۔ مجھ کو جتنا بھی شعور میرے مالک نے بخشا اُس کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے میں نے زندگی کا اپنی سوچ کی حد تک مطالعہ کیا ہے اور جہاں جہاں سے مجھے حکمِ الٰہی کی تکمیل میں گزارا گیا اُس کا میں خود گواہ ہوں اور اپنے مقدمے کا وارث بھی مجھے عدل و انصاف سے مایوسی نہیں بشرطیکہ عدالت دُنیا نہ ہو۔ اور اگر عدالت لازمی دُنیا ہی ہو تو پھر قوانین خداوندی جو خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں پہ عائد کر رکھے ہیں انہی قوانین کا حقیقی وارث بھی موجود ہو جو کہ ابھی پردہِ غیبت میں مشیت الٰہی پر صبر و قرار کی منازل طے کر رہا ہے خیر حکمِ الٰہی کی تکمیل میں مجھے جن جن مقامات سے گزارا گیا خواہ وہ میری مرضی سے تھا یا جبراً۔ بہر حال ہر مقام پہ یہی سوچ کر گزر گیا اور خود کو دلاسا بھی دیتا رہا کہ یہی تو دنیا ہے بے اختیاری اور انجان مسافت۔ یہی تو دنیا ہے جہاں نہ تو میں اپنی مرضی سے آیا اور نہ اِس میں اپنی مرضی سے اِختیار سے رہا اور نہ ہی یہاں سے مجھے اپنی مرضی سے جانا ہے اب اگرچہ بظاہر پاؤں میرے اپنے ہیں مگر میری التجا کی نہیں کسی اور کے حکم کے منتظر ہیں میں تو ایسے ہوں جیسے کوئی کسی قافلے کے ساتھ کسی بے مہار سواری پہ سوار ہو اور وہ اُس کو جہاں چاہے لے جائے میں تو محو تماشا ہوں اپنا بھی لوگوں کا بھی۔ بالکل ایسے کہ جیسے آنکھیں سفر میں ہوں اور جسم ساکن ہو میں تو بس اپنی تھکن سمیٹ کر اپنی ہی سزا کا مستحق ہوں۔ بس اور کچھ بھی نہیں بے نام و نشاں بے رُوح لمحوں نے مجھے اپنے حصار میں گھیر رکھا ہے اور اِس اسیری سے چاہوں بھی تو رہائی پانا ایسے ہے جیسے دنیا کی حدود سے نکل جانا۔ اور پھر زیست کیا ہے! سوائے اُن چند سالوں کے جو میں نے بہ ہوش وحواس گزارے اور باقی سب اندھیرا ہے' حال کیا ہے! وہ چند لمحے جو تیز گھوڑوں کے پاؤں کی ٹاپوں کے سوا اور کچھ نہیں اور مستقبل کیا ہے! اِک خیال جس کو حقیقت کے آئینے میں دیکھنا ممکن نہیں اور آئینہ کیا ہے! اِک سراب اِک غبار جو کہ اگر ہٹ جائے تو اَن دیکھے مناظر نمودار ہوں جو کہ سوچ کی دسترس سے ماورا ہیں۔ تو میں بھلا کب تک اُن خیالوں کے تعاقب میں چلوں جو کہ اگر رستہ بدل جائیں تو اُن کے

پیچھے چلنے والا خود اپنے ہی سائے سے اُلجھ کر بھٹک جائے۔ اور ماضی بھی تو اِک لفظ کی شکل میں مضمون ہے جس نے کتنے ہی زمانے اپنے اندر محفوظ کر رکھے ہیں لیکن درحقیقت کچھ بھی نہیں دُنیا کی ناپائیداریوں کا زندہ ثبوت ماضی

بہر حال میں نے زندگی کے انمول لمحات سے الفاظ کے وہ نادر و نایاب موتی تراشے ہیں جو کہ شبوں کی تاریکیوں میں اگر جگمگائیں تو دِن ہو جائے۔ اور دِن میں کتنے سورج اِن کے سامنے ماند پڑ جائیں میری زندگی کی مسافتوں میں میری شاعری ہی میری ہم سفر ہے اور میری سچی دوست بھی۔ یہی تو ہے جو تنہائیوں میں مجھے تنہا نہیں ہونے دیتی اور یہی میری تنہائیوں کو یادگار بنا دیتی ہے یہی میری زندگی کا اثاثہ ہے اور یہی حاصلِ جاں بھی۔ یہ ایسی دولت ہے کہ جس کو تمام دنیا کی دولت دے کر بھی نہیں خریدا جا سکتا۔ جب تک میں زندہ ہوں اپنے الفاظ وفن کے حصار میں ہوں اور جب میں نہیں ہوں گا تو یہی الفاظ صحرا میں جگہ بدلتی ریت کو اتنی جرات نہیں دیں گے کہ وہ میرے نام و نشاں اور میرے نقوش کو مٹا سکے۔

سید عقیل شاہ

فہرست

صفحہ	عنوان	نمبر شمار
۱۰	عظیم کیا تُو عظیم تر ہے (حمد)	۱-
۱۲	منزلوں سے بھی کہیں آگے سفر ملتے ہیں	۲-
۱۴	ان دیکھے خوابوں کا پیمان سی اِک زندگی	۳-
۱۶	وہ ادھورے زیست کے لفظ تھے انھیں کیا لکھو گے یہ جان کر	۴-
۱۸	آج کا دِن اگر گزر جائے	۵-
۲۰	چلو سوچیں (نظم)	۶-
۲۳	وہی بے وجہ سی اداسیاں کبھی وحشتیں ترے شہر میں	۷-
۲۵	در پہ جو انتظار کی عادت نہیں ہوئی	۸-
۲۷	سمندر تھا مسافت کا مگر اِک قافلہ تنہا	۹-
۲۹	روز اِک داستاں نئی اور تم	۱۰-
۳۱	بھلا تو دے گا (نظم)	۱۱-
۳۳	خزاں کی رت میں بہار لمحے تلاش کرنے کی کیا پڑی ہے	۱۲-
۳۵	شام کے سائے جو پیڑوں سے اُتر جاتے ہیں	۱۳-
۳۷	بہت بے چین رہتا ہوں تمھیں اس کی خبر کیا ہو	۱۴-
۳۹	میری تنہائی ہے شاید (نظم)	۱۵-
۴۱	وہ ایک منزل مسافتوں میں جو کھو گئی تھی وہ ڈھونڈتا ہوں	۱۷-
۴۳	محبتوں کے یقیں میں آ کر دغا ہوا نا وہی ہوا نا	۱۸-
۴۵	ضبطِ احساسِ محبت کا بیاں تک نہ ملے	۱۹-

صفحہ	عنوان	نمبر شمار
۴۷	نہ وہ خواب ہیں نہ خیال ہیں کوئی زندگی کی صدا نہیں	۲۰-
۴۹	تمھیں اُس شب بہت سوچا (نظم)	۲۱-
۵۲	کبھی تو کچھ کہو تم بھی	۲۲-
۵۴	میرے دشمنوں کی نہ بات کر مجھے دوستوں کی تلاش ہے	۲۳-
۵۶	تیرے ذہن سے وہم کے پردے اُتر گئے تو بات ہوگی	۲۴-
۵۴	نہ وہ خواب تھا نہ خیال تھا کوئی یاد تھی میرا درد تھا	۲۵-
۵۸	اُسے تو بھول جانا تھا (نظم)	۲۶-
۶۴	میرے ذہن میں جو نقش تھا اُسے عمر بھر نہ مٹا سکا	۲۷-
۶۵	ایامِ نحس کو گھر میں ٹھہر کے دیکھتے تھے	۲۸-
۶۶	نظر ملانا نظر چرانا وہ روٹھ جانا بھی یاد آیا	۲۹-
۶۷	اب تیرا ہم سفر بھی رہنا ہے اور بچھڑنے کا ڈر بھی رہنا ہے	۳۰-
۶۹	سنو جاناں (نظم)	۳۱-
۷۱	صدائیں سو گئیں تھک کر (نظم)	۳۲-
۷۳	وقتِ رخصت (نظم)	۳۳-
۷۶	تم سے اتنا ہی صرف کہنا تھا	۳۴-
۷۸	خیالِ ماضی (نظم)	۳۵-
۷۹	اُداس لمحوں کے سلسلے تھے	۳۶-
۸۱	یونہی بے سبب ترے شہر سے جو گزر گیا تو اداس ہوں	۳۷-
۸۳	میں نے تم سے پھر نہیں ملنا	۳۸-
۸۵	دستک (نظم)	۳۹-
۸۷	احتساب زندگی (نظم)	۴۰-

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۴۱-	خطوں میں لکھے ہوئے فسانے گئی رتوں کا پیام دیں گے	۸۹
۴۲-	انتظار (نظم)	۹۰
۴۳-	تلاش (نظم)	۹۱
۴۴-	نہ وہ جھولے نہ کہیں ہم جولیوں کے سلسلے	۹۳
۴۵-	فکرِ انساں سے کہیں آگے جہاں زندہ ہے	۹۴
۴۶-	اک عالمِ ارواح سے دھکیلا ہوا میں ہوں	۹۶
۴۷-	رات سایہ سا کوئی شہرِ اماں سے نکلا	۹۸
۵۱-	ہوا کی زد میں جو آ گئے تھے وہ اشیانے بکھرتے دیکھے	۱۰۰
۴۸-	صلیبِ زیست (نظم)	۱۰۲
۴۹-	یہ اُس کی قسمت (نظم)	۱۰۳
۵۰-	محبت مٹ گئی میری (نظم)	۱۰۵
۵۱-	تحریریں (نظم)	۱۰۷
۵۲-	احتسابِ زندگی (نظم)	۱۱۰
۵۳-	اُسے گنوا کر تلاش کرنا عجیب عادت بنا رکھی ہے	۱۱۶
۵۴-	اداسیوں کے سفر پہ نکلے تو گردِ راہ ہی اُٹھا کے لائے	۱۱۸
۵۵-	کچھ اشعار	۱۱۹
۵۶-	جب یہ رشتہ نبھا نہیں سکتے	۱۲۰
۵۷-	بچھڑے ہوئے لوگوں پہ ماتم نہ کیا کر	۱۲۲
۵۸-	ہم مسافر ہیں بھری شب میں کدھر جائیں گے	۱۲۴
۵۹-	بڑی بے سبب ہے یہ دل گی کہیں دن ہوا کہیں شب ڈھلی	۱۲۶
۶۰-	مجھے اک بات کہنی ہے (نظم)	۱۲۸

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۶۱-	خواب نگر (نظم)	۱۳۰
۶۲-	موبائل میسج (نظم)	۱۳۳
۶۳-	تمہیں جانا ہی تھا آخر (نظم)	۱۳۵
۸۴-	بہت ہی معتبر ہوں میں (نظم)	۱۳۸
۷۵-	شام ہوتی ہے تو پھر دن پہ نظر رکھتے ہیں	۱۴۱
۷۶-	دل کے اوراق پہ جاگیر بدل دیتے ہیں	۱۴۳
۷۷-	یہاں کس نے پائیں ہیں منزلیں کیوں اداس ہے میرے دل بتا	۱۴۴
۷۸-	صراطِ غم پہ عدو نے پُوچھا میری اذیت کے سلسلے میں	۱۴۶
۷۹-	اے میری انجان مُسافت (نظم)	۱۴۹
۸۰-	محبت کون سمجھا ہے (نظم)	۱۵۱

عظیم کیا تو عظیم تر ہے

اے میرے مالک
تمہاری عظمت کی وسعتوں میں
تمہاری رحمت کی حد نہیں ہے
زمانے کون ومکاں
کے مل کر
تمہاری وسعت کو پا سکے نہ
خلا کی وسعت میں کتنے سورج
تمہارے آگے بنے ہیں سرمہ
پہاڑ جھک کر
تمہارے آگے کھڑے ہوئے ہیں
تمہاری حمد وثنا میں گم ہیں
سمندروں پہ تمہاری ہیبت سے
کانپتی ہیں ہوا کی لہریں
کہ تیز طوفاں لرز لرز کے
تیرے قہر سے امان چاہیں

یہ بجلیاں آسمان سے گر کر
تیرے غضب کا پیام لائیں
یہ سارے جنگل تجھے پکاریں
پرندے کمزور پر پھیلائے
تمہاری رحمت کو ڈھونڈتے ہیں
اے میرے مالک
میں کیسے لکھوں
تمہاری عظمت کے تذکرے میں
شعور کی منزلوں سے آگے
تمہاری رحمت کی اِبتدا ہے۔۔





منزلوں سے بھی کہیں آگے سفر ملتے ہیں
بستیوں میں بھی کئی خستہ شہر ملتے ہیں

جب بدلتا ہے کبھی دریا کہیں سے رستہ
تو کناروں پہ فقط ریت کے گھر ملتے ہیں

جن پہ بیٹھے ہی نہیں خوف کے مارے پنچھی
سبز پیڑوں میں بھی کچھ ایسے شجر ملتے ہیں

کون دیتا ہے میرے نام کی دستک رُک کر
اب فقیروں کو یہاں اور بھی در ملتے ہیں

تم تو نکلے ہو یہاں شوقِ سفر کی خاطر
راستوں میں تو بڑے گہرے بھنور ملتے ہیں

حادثہ ایک ہی گزرا ہے کسی رُت پہلے
مجھ کو اَب تک وہ غمِ جاں کے اثر ملتے ہیں

یہ روایت ہے یہاں دشتِ وفا کی لوگو
خون دیتے ہیں تو پیڑوں سے ثمر ملتے ہیں

ہو گئے لوگ میرے شہر کے مر کر موتی
آج بھی دیکھو عقیلؔ اُن کے ہنر ملتے ہیں



ان دیکھے خوابوں کا پیمان سی اِک زندگی
تنہائی خاموشی ویران سی اِک زندگی

بکھرے ہوئے خوابوں کا اِک شہر پرانا سا
ہر موڑ پہ تنہائی پریشان سی اِک زندگی

ہروقت کوئی اِک ڈر ہر وقت کوئی اُلجھن
ہر سمت کئی رستے انجان سی اِک زندگی

اُڑتے ہوئے پتوں میں مٹتے ہوئے لفظوں میں
سوکھے ہوئے ہونٹوں میں بے جان سی اِک زندگی

چلتی ہوئی سڑکوں پر زندگی کی ضرورت میں
اِک شور سا ہر جانب طوفان سی اِک زندگی

ماضی کے حسابوں میں کسی شام کو تھک کر پھر
اِک یاد کا حاصل کچھ نقصان سی اِک زندگی

گزرے ہوئے لمحوں کا ماتم سا کوئی دل میں
صبح و شام کسی غم کا عنوان سی اِک زندگی



وہ ادھورے زیست کے لفظ تھے انہیں کیا لکھو گے یہ جان کر
بڑی مختصر سی ہے داستاں اِسے کیا سنو گے یہ جان کر

کچھ خواب تھے مرے ہم سفر کچھ خواہشوں کا ملال تھا
مرے دِل میں کس کا خیال تھا اَب کیا کرو گے یہ جان کر

اِک ترے فراق کا زہر ہی میرے دِل سے روح میں اتر گیا
میں ٹوٹ کر ہوں بکھر گیا مجھے کیا چنو گے یہ جان کر

وہ گلاب تیری یاد کے اِن ہی راستوں میں بکھر گئے
سرِ عکس مجھ کو خزاں میں پھر یوں ہی کب ملو گے یہ جان کر

تھی خاموشیوں کی وہ داستاں جسے کہہ کے لب بھی ہلے نہیں
جسے تم نے سن کے سنا نہیں پھر کیا کہو گے یہ جان کر

تیری مسکراہٹ عزیز تھی کبھی کچھ بھی تم سے کہا نہیں
میرا کس طرح کا نصیب ہے تم رو پڑو گے یہ جان کر

ہیں طویل تر ہیں مسافتیں شب و روز اِن کے خیال میں
مجھے منزلوں کی خبر نہیں تم کیا چلو گے یہ جان کر



آج کا دِن اگر گزر جائے
زیست شاید کہ پھر سنور جائے

چلو لمحے گزار دیں ہنس کر
یہ نہ ہو سال ہی ٹھہر جائے

خواب جاگیر ہو نہیں سکتے
کوئی اِن کو سنبھالے مر جائے

یہ دُعا ہے کوئی میری طرح
اِس نئے سال نہ بکھر جائے

رات گھر میں کریں گے جا کے بسر
سر سے سورج اگر اُتر جائے

جس پہ ویرانیاں برستی ہیں
راستہ شاید ترے شہر جائے

جس کو شب میں نہ مل سکی راحت
اَب وہ سورج بھلا کدھر جائے

چلو سوچیں

چلو سوچیں وہی لمحے
جو اَب کے خواب لگتے ہیں
وہ موسم جو پرائے ہیں
اُنہیں پھر ڈھونڈنے نکلیں
چلو دیکھیں
وہی گلیاں
جہاں کچھ لوگ رہتے تھے
کہاں ہیں اَب
چلو سوچیں
چلو سوچیں وہ لہراتی ہوئی
صبح و شام کی خوشیاں
جہاں کسی مسکراہٹ سے
جیسے کہ دِن نکلتا تھا
کسی آواز کے بدل
ہوائیں سرسراتی تھیں

جہاں کسی زلف کے سائے
شامیں گنگناتی تھیں
مگر وہ دِن کہاں ہیں اَب
کہاں شامیں گئیں آخر
چلو سوچیں
وہی زندگی
جسے تنہائی کی وحشت سے
تڑپنا تھا سسکنا تھا
مگر مجبوریاں بھی تھیں
اسے تنہا گزرنا تھا
وہی زندگی جسے امید کی اِک
لوَ میں جلنا تھا
وہ ہی زندگی جسے میں نے سدا
عذاب سمجھا تھا
کہاں پہ کٹ گئی آخر چلو سوچیں
چلو سوچیں

کہاں بیتے ہوئے وہ پل
ابھی بھی رقص کرتے ہیں
کہاں یادوں کے سائے ہیں
کہاں موسم بدلتے ہیں
چلو مانگیں
وہی گھڑیاں
جو پھر آ ہی نہیں سکتیں
چلو اُس جا چلیں
جس جا
اَبھی بھی دِل تڑپتا ہے
جہاں کسی سائے کی مانند
کوئی میرے ساتھ چلتا ہے
مگر وہ کون ہے آخر
چلو سوچیں۔۔



وہی بے وجہ سی اداسیاں کبھی وحشتیں ترے شہر میں
تُو گیا مجھ سے بچھڑ گئیں سبھی رونقیں ترے شہر میں

میری بے بسی کی کتاب کا کوئی ورق تُو نے پڑھا نہیں
تمہیں کیا خبر کہاں مر گئیں مری خواہشیں ترے شہر میں

سبھی ہاتھ مجھ پہ اُٹھے یہاں سبھی لفظ مجھ پہ کسے گئے
مری سادگی کے لباس پر پڑی سلوٹیں ترے شہر میں

وہ جو خستہ حال غریب تھے کہیں بستیوں میں مقیم تھے
اُنہیں کیا ہوا کہ وہ سہہ گئے سبھی تہمتیں ترے شہر میں

یہاں لوگ بکتے ہیں دوستوں یہاں تاجروں کی کمی نہیں
ہر شخص کی ہیں لگی ہوئیں کئی قیمتیں ترے شہر میں

تُو یادِ ماضی میں ہے مگر کئی خواب اور بھی تھے عقیلؔ
پھر یہ ہوا کہ دفن ہوئیں سبھی چاہتیں ترے شہر میں

☆

در پہ جو انتظار کی عادت نہیں ہوئی
دستک ہوا کو دینے کی فرصت نہیں ہوئی

یہ سال بھی اداسیاں دے کر گزر گیا
اِس سال بھی کسی سے محبت نہیں ہوئی

کیسا عجیب ربط ہے وحشت کے باواجود
دل کو تمہارے نام سے نفرت نہیں ہوئی

ہر خواب بِک گیا مرا مجبوریوں کے ہاتھ
پوری کسی سے آج تک قیمت نہیں ہوئی

ہر سانس کا خراج تھا یادِ غمِ حیات
پھر مجھ سے اُس کے فرض میں غفلت نہیں ہوئی

مجھ کو تو خیر وقت نے مہلت نہ دی کبھی
تم سے تو یہ ہوا کہ زحمت نہیں ہوئی

میں وقت کے بہاؤ میں ٹھہرا رہا عقیل
میری زمانے بھر کو ضرورت نہیں ہوئی



سمندر تھا مسافت کا مگر اِک قافلہ تنہا
رہا پھر عمر بھر یادوں کا جیسے سلسلہ تنہا

دُھواں تھا شور تھا اور خواب بھی جلتے رہے شب بھر
فقط ہم نے ہی دیکھا ہے ابھی یہ حادثہ تنہا

ہزاروں چاند آنکھوں میں اُتر کر ہو گئے مٹی
بلاتا ہی رہا شب بھر مجھے اِک راستہ تنہا

سزا جھیلی تو ہے اِس نے ہمیں یوں بانٹ رکھنے کی
ہمارے درمیاں آکر رہا یہ فاصلہ تنہا

یہ رستے آس کے رستے وہ دولت یاد کی دولت
کسی کو عمر بھر چاہنے کا اَب کے یہ صلہ تنہا

مسافت در مسافت اور یہاں دشتِ بیاباں میں
بھلا کب تک چلے یونہی مرا یہ حوصلہ تنہا



روز اِک داستاں نئی اور تم
وحشتوں سے وہ دوستی اور تم

اَب ہے صدیوں سے ہم سفر میری
یہ خیالوں کی چاندنی اور تم

شام باقی ہے چند لمحوں کی
بس ذرا سی ہے زندگی اور تم

منزلوں کے فریب اور اِک میں
راستوں سے وہ آگہی اور تم

کھو گئے ریگزارِ دنیا میں
وقتِ رفتہ وہ اَن کہی اور تم

کون جانے یہ سلسلہ کیا ہے
میں کہ خود سے بھی اجنبی اور تم

بس وہی پل تو حاصلِ جاں ہیں
تجھ سے پہلی سی دل لگی اور تم

بھلا تو دے گا

بھلا تو دے گا
مگر ابھی کچھ
گزشتہ لمحوں کا ذکر لے کر
خزاں کی رت میں
آوارہ پتوں کے سنگ چلے گا
ہوا کی لہروں
پہ چپکے چپکے
عذابِ جاں کے ستم لکھے گا
ابھی تو وہ بھی
اسیرِ غم ہے
اُسی مسافت پہ گام زن ہے
ابھی تو کچھ دِن
میری طرح وہ
شکستہ خوابوں کی کرچیوں کو
وہ نرم ہاتھوں کی انگلیوں کے

جو زخمی پوروں سے وہ چُنے گا
تو کیا کرے گا
گماں کے رستوں پہ آتے جاتے
کسی تجسس میں جب رُکے گا
میرا یقیں ہے
کہ رو پڑے گا
مگر کہاں تک
نئے دنوں کو گئے دنوں پہ
وہ ٹال رکھے
گزشتہ لمحوں کی تتلیوں کو
بھلا کہاں تک سنبھال رکھے
ابھی تو کچھ دِن
گئی رتوں کا بھرم رکھے گا
سہم سہم کر قدم رکھے گا
بھلا تو دے گا
مگر ابھی کچھ۔۔

☆

خزاں کی رُت میں بہار لمحے تلاش کرنے کی کیا پڑی ہے
جو اَب کے موسم ٹھہر گیا ہے اُسے بدلنے کی کیا پڑی ہے

ابھی تو شامِ عذابِ جاں کی بڑی ہی پُر سوز ابتدا ہے
ابھی ہے شبِ فراق باقی ابھی سے جلنے کی کیا پڑی ہے

شہر کی رونق تو چھن گئی ہے اُداس گلیاں ویران راستے
بسر کرو دِن یہ اپنے گھر میں کہیں نکلنے کی کیا پڑی ہے

گزر ہی جائیں گے سُرخ لمحے تلاش جن کو نہ کر گے
میں تیرے لہجے سے بدگماں ہوں تجھے بچھڑنے کی کیا پڑی ہے

گلے ملیں گی تمام تر وہ اذیتیں راستوں میں آ کر
ٹھہر ہی جاؤ اداس رت میں کسی سے ملنے کی کیا پڑی ہے

بڑی ہی سادہ سی دلفریب اِک سفید لمحوں کی داستاں ہے
نجانے سادہ سے کاغذوں پہ یوں رنگ بھرنے کی کیا پڑی ہے

امیدیں دشتِ ویراں میں کچھ پل اگر رہیں گی تو کیا بُرا ہے
عقیلؔ پوچھو تو بادلوں سے اِنہیں گزرنے کی کیا پڑی ہے



شام کے سائے جو پیڑوں سے اُتر جاتے ہیں
ہم بھی چلتے ہوئے پھر تیرے شہر جاتے ہیں

لَوٹ کر آتے ہیں جب رات گئے ہم گھر کو
پاؤں دہلیز پہ رکھتے ہیں تو مر جاتے ہیں

بیٹھ جاتے ہیں یہیں اجنبی پیڑوں میں کہیں
یہ پرندے بھی کہاں لَوٹ کے گھر جاتے ہیں

روز ترکیب بناتا ہوں اُسے پانے کی
روز بے کار مرے سارے ہنر جاتے ہیں

دُور تک پھیلا ہوا حدِ نظر صحرا ہے
اِس کے رستے کے معلوم کدھر جاتے ہیں

کس قدر سہمے ہوئے لوگ ہیں اُس بستی کے
اپنا سایہ بھی نظر آئے تو ڈر جاتے ہیں

سانس باقی ہے تو پھر چلتے رہو تم بھی عقیلؔ
سوکھ جاتے ہیں وہ دریا جو ٹھہرا جاتے ہیں

☆

بہت بے چین رہتا ہوں تمہیں اِس کی خبر کیا ہو
ہزاروں درد سہتا ہوں تمہیں اِس کی خبر کیا ہو

تم جب کسی نیند کی دہلیز میں خوابوں میں کھو جاؤ
تری گلیوں میں چلتا ہوں تمہیں اِس کی خبر کیا ہو

شہر کی رَونقیں مجھ سے خفا سی ہو گئیں اور میں
بھرے شہر میں تنہا ہوں تمہیں اِس کی خبر کیا ہو

فضائے شہر میں تو ہے میں جنگل میں درختوں پر
تیرا ہی نام لکھتا ہوں تمہیں اِس کی خبر کیا ہو

تجھے کھونا تجھے پانا تجھے پاکر بھی کھو جانا
میں کس اُلجھن میں رہتا ہوں تمہیں اِس کی خبر کیا ہو

ذرا سی دیر میں گر ہی ریزہ ہو گیا جیسے
میں کس طرح سے بکھرا ہوں تمہیں اِس کی خبر کیا ہو

سبھی کُچھ کھو گیا مجھ سے فریبِ زندگانی میں
میں اَب لوگوں سے ڈرتا ہوں تمہیں اِس کی خبر کیا ہو

تو بادل ہے تو بارش ہے تو خوشبو ہے تو موسم ہے
میں اِک ویران صحرا ہوں تمہیں اِس کی خبر کیا ہو

میری تنہائی ہے شاید

یہ کالے پیراہن میں
کون رقصاں ہے میرے گھر میں
سکوتِ شب میں
دیواروں سے
کیسا شور ہے برپا
لباسِ چاندنی میں کون اترا ہے
میرے گھر میں
یہ کس کے پاؤں کے آہٹ
یہاں پہ اُس کے ہونے کا مجھے
اِحساس دیتی ہے
کوئی شے ہے دبے لہجے میں
اِک آواز دیتی ہے
مگر کچھ بھی نہیں کہتی
وہ تنہا تو نہیں
پسِ سایہ یہاں اِک قافلہ بھی ہے

جہاں لمحے
صلیبِ زیست پہ لٹکے
کوئی فریاد کرتے ہیں
یہ کس کو یاد کرتے ہیں
چلو چھوڑو
وہی ہوگی
میرے گھر کے در و دیوار میں
جس کا بسیرا ہے
میری تنہائی ہے شاید۔۔



وہ ایک منزل مسافتوں میں جو کھو گئی تھی وہ ڈھونڈتا ہوں
گئے زمانے میں چاہتوں کی جو بے بسی تھی وہ ڈھونڈتا ہوں

ترس گئی ہیں یہ میری آنکھیں نجانے کب یہ وصال ہو گا
تمہاری خواہش کے اُن دنوں میں جو زندگی تھی وہ ڈھونڈتا ہوں

میں کھوجتا ہوں وہ نقش سارے جو اَب کے موسم کھو گئے ہیں
وہ اِک ادھوری سی داستاں جو کہیں لکھی تھی وہ ڈھونڈتا ہوں

زمانے بھر کی آسائشیں بھی مرے مقدر میں رائیگاں ہیں
تمام زندگی کی نعمتوں میں جو اِک کمی تھی وہ ڈھونڈتا ہوں

یہاں تو ٹھہرا ہے زرد موسم خزاں رسیدہ سے رہ گئے ہم
تمہارے سنگ مسافتوں جو اِک خوشی تھی و ہ ڈھونڈتا ہوں

میری کتابوں زرد رت کے گلاب سوکھے رکھے ہوئے ہیں
بہار رت کی اِنہی گلوں جو اِک تازگی تھی وہ ڈھونڈتا ہوں

میں تھک گیا ہوں یوں چلتے چلتے ویران رستوں پہ سفر کرتے
اِسی شہر میں تمہارے گھر کی جو اِک گلی تھی وہ ڈھونڈتا ہوں

عقیلؔ چاہت پرانی ہو کر عذابِ زندگی ہی بن گئی ہے
وہ پہلی پہلی یوں تم سے میری جو دِل لگی تھی وہ ڈھونڈتا ہوں

☆

محبتوں کے یقیں میں آ کر دغا ہوا نا وہی ہوا نا
وہ ایک ضد پہ زمانہ سارا خفا ہوا نہ وہی ہوا نا

وہ جس کی خاطر زمانے بھر سے لی دشمنی تم نے عمر بھر کی
وہ شخص تم سے کسی گلی میں جدا ہوا نا وہی ہوا نا

وہ جس کو تم نے مٹانا چاہا تھا دل کے خستہ سے کاغذوں سے
وہ نام اکثر اداس پیڑوں پہ خود لکھا نا وہی ہوا نا

بچھڑتے لمحے وہ جس کی آنکھوں میں اشک آئے تھے میرے غم میں
وہ آج غیروں کے ساتھ ہنستے ہوئے ملا نا وہی ہوا نا

وہ جس کی تعبیر ڈھونڈنے میں گنوائی نیندیں تھیں عمر بھر کی
وہ خواب آنکھوں کے ساحلوں پہ ہی جل بجھا نا وہی ہوا نا

کہا تھا چھوڑو سراب رستے نہ پکڑو کاغذ کی تتلیوں کو
اِنہیں خیالوں میں وقت سارا گزر گیا نا وہی ہوا نا

وجود تو بانٹ لے گیا تھا زمانہ مجھ سے عقیل اب تو
کسی کی یادوں کا ایک سایہ ہی سنگ چلا نا وہی ہوا نا



ضبطِ احساسِ محبت کا بیاں تک نہ ملے
جل اُٹھے جسم مگر اُس کا دھواں تک نہ ملے

ایسے جذبات حقیقت میں سزا ہوتے ہیں
جن کے اظہار میں لفظوں کو زباں تک نہ ملے

یہ تعلق تو جہاں تک تُو مجھے چاہتا ہے
تم کو ممکن ہے مرا ساتھ وہاں تک نہ ملے

یہ غنیمت ہے کہ قائم ہے محبت کا بھرم
کل یہ ممکن ہے ہمیں اپنا نشاں تک نہ ملے

رہ گئے خواب خیالوں میں بدل کر وہ لوگ
اب انہیں ڈھونڈنا چاہیں تو گماں تک نہ ملے

تُو مجھے ڈھونڈ نہ پائے گا کہ جب تک تُو بھی
خود سے نکلے تو مجھے آ کے یہاں تک نہ ملے

اِس بھرے شہر میں اُس جگہ پہ رہتا ہوں عقیل
تم کو آنے میں لگیں صدیاں مکاں تک نہ ملے



نہ وہ خواب ہیں نہ خیال ہیں کوئی زندگی کی صدا نہیں
کیا سناؤں تم کو میں داستاں مرے پاس کچھ بھی رہا نہیں

کبھی راستوں سے نا آشنا میں چلا تھا قربتیں ڈھونڈنے
مجھے منزلوں نے سکھا دیا کچھ فاصلوں کے سوا نہیں

کئی رنگ تھے جو بکھر گئے کچھ لوگ تھے جو گزر گئے
وہ دریا سارے اُتر گئے اَب اُن رتوں کی فضا نہیں

میرے لب پہ حرفِ گلہ نہیں یہ نصیبِ جاں کے ہیں سلسلے
مجھے جو ملا مری بے بسی میری زندگی میں وفا نہیں

وہ جو تیرے میرے تھا درمیاں اِک خواب تھا کہ سراب تھا
جو سُنا وہ تم نے کہا نہیں جو کہا وہ تم نے سنا نہیں

مری زندگی کی کتاب میں بڑی حسرتوں کے ہیں تذکرے
میرا ہم سفر جو خیال تھا سرِ ورق اُس کو لکھا نہیں

اب کیا کہوں کہ وہ کون تھا کوئی ساتھ تھا مرے پاس تھا
مجھے یاد ہے وہ ذرا ذرا وہ کہاں گیا یہ پتہ نہیں

تمہیں اُس شب بہت سوچا

تمہیں اُس شب
بہت سوچا
کہ جب بادل بھی چھائے تھے
بڑی ہی تیز بارش تھی
ہوا بارش کے قطروں سے
بڑی اٹکھیلیاں کر کے
میرے کمرے کی کھڑکی سے
ٹکرا کر
بڑا ہی شور کرتی تھی
چمکتی بجلیاں بھی تو
اُسی کھڑکی کے رستے سے
ذرا سی دیر
رُک رُک کر
مجھے ہی جھانکتیں تھیں بس

ہوا کے تیز جھونکے بھی
چپکے سے
دبے پاؤں ہی آتے تھے
میری ٹیبل پہ رکھے
کاغذوں کو بھی اُڑاتے تھے
اُن ہی کاغذوں پہ لکھی کچھ
تیری نظمیں
بھی تھیں شاید
جنہیں خونِ جگر سے لکھ کر
ابھی ٹیبل پہ رکھا تھا
ہوا سے اُڑ گئے ایسے
وہ سارے لفظ بھی جیسے
ساحل کی ریت پہ
لکھ کر
لکھا جیسے نہیں ہوتا
کوئی زندگی میں مل کر بھی
ملا جیسے نہیں ہوتا

محبت خواب تھی سوچا
کوئی سراب تھی سوچا
گئے بادل
گئی بارش
ہوا بھی تھم گئی لیکن
تمہیں اُس شب بہت سوچا۔۔

☆

کبھی تو کچھ کہو تم بھی
کہا ہے جو سنو تم بھی

سرِ راہ جب ملو مجھ سے
کبھی کچھ پل رُکو تم بھی

گِرا ڈالو فصیلیں سب
مجھے اِک شام ملو تم بھی

میں تنہا تھک گیا ہوں اَب
میرے سنگ چلو تم بھی

میری زندگی کے کاغذ پر
نئے کچھ غم لکھو تم بھی

صدا برہم سے رہتے ہو
کبھی کچھ پل ہنسو تم بھی

ادھورا شہر ہے جیسے
یہاں پہ آ بسو تم بھی

مجھے تم سے محبت ہے
کہ لا پرواہ سے ہو تم بھی



میرے دشمنوں کی نہ بات کر مجھے دوستوں کی تلاش ہے
وہ جو راستے ہیں وفاؤں کے اُنہی راستوں کی تلاش ہے

مجھے نفرتوں کے عذاب سے کوئی ہو جو آ کے بچا سکے
جو دِل سے روح میں سما سکیں اُنہی چاہتوں کی تلاش ہے

میں یہ چاہتا ہی نہیں مجھے وہی لوگ پھر سے ملیں کہیں
پسِ آرزو جو گزر گئیں اُنہی ساعتوں کی تلاش ہے

جو ملوں تو مجھ سے جدا نہ ہو جو بچھڑ چلوں تو ہوں منتظر
مجھے چاہتوں میں یوں ہر گھڑی اُن ہی شدتوں کی تلاش ہے

میں بھٹک رہا ہوں خواہشوں کے سراب میں کہیں جا بجا
جو مرے گناہوں کو دھو سکیں اُن ہی واسطوں کی تلاش ہے

بھلا کون ہو میرا ہمسفر میرے ساتھ کوئی چلے تو کیا
مجھے راستوں میں ذرا ذرا سے جو آسروں کی تلاش ہے

ہے عجیب میرا بھی فلسفہ مجھے محفلوں سے بھی دُور عقیلؔ
کہیں جنگلوں کی ہے جستجو کہیں وحشتوں کی تلاش ہے



تیرے ذہن سے وہم کے پردے اُتر گئے تو بات ہو گی
میری طرح سے وہ خواب تیرے بکھر گئے تو بات ہو گی

سراب منزل کی جستجو میں کسی کی ناکام آرزو میں
یہ زندگی کے حسین لمحے گزر گئے تو بات ہو گی

ابھی تمہیں کچھ خبر نہیں ہے کسی کے سائے میں گامزن ہو
دہکتے صحرا میں جب یہ سائے بچھڑ گئے تو بات ہو گی

تنہائیوں میں اداس رت کی کبھی برستی جو بارشوں سے
وہ زخم سارے گلاب صورت نکھر گئے تو بات ہو گی

تمہارے دِل کے نگر میں اب تو ہزار موسم بدل رہے ہیں
جہاں یہ موسم عذاب بن کر ٹھہر گئے تو بات ہو گی

عقیلؔ چاہت کے زرد موسم صِلے وفاؤں کے نام تیرے
گزشتہ سارے عذاب قصے جو کر گئے تو بات ہو گی



نہ وہ خواب تھا نہ خیال تھا کوئی یاد تھی میرا درد تھا
یہ پتے کیسے بکھر گئے کیا ہوا چلی میرا درد تھا

دے کر صدائیں پلٹ گئیں وہ تمام دِن کی رونقیں
جو شام دِل میں ٹھہر گیا مری بے بسی میرا درد تھا

شب بھر بلاتا رہا مجھے کوئی چاند تھا یا ستارا اِک
بڑی دیر تک رہی ہم سفر کوئی چاندنی میرا درد تھا

تجھے کیا بتاؤ اے بدگماں ترے گفتگو کے حصار میں
اِک بات تھی مرے ذہن سے جو اُتر گئی میرا درد تھا

جسے تم نے سن کے سنا نہیں جسے کہہ بھی نہ میں کہہ سکا
جو لب پہ آ کے ٹھہر گئی وہ ہی اَن کہی میرا درد تھا

مجھے اُن رتوں کی تلاش ہے جو سمے کے ساتھ گزر گئی
جو ترے خطوں میں پڑی رہی وہی شاعری میرادرد تھا

اُسے تو بھول جانا تھا

یہی تو سوچ رکھا تھا
جیون ایسے بتانا تھا
جیسے ہر سانس
کے بدلے
کوئی قرضہ چکانا تھا
وہی وعدہ نبھانا تھا
گزشتہ موسموں کے سب
لکھے ہوئے ادھورے لفظ
جنہیں کوئی نہ پڑھ پائے
سمجھ پائے
نہ سن پائے
اُنہیں آخر مٹانا تھا
اُسے تو بھول جانا تھا
اُسے پھر یاد کیوں رکھا
وقت کی ڈائری سے جب

گزشتہ سارے لمحوں کو
بیتے سارے زمانوں کو
جو اَب کے خواب لگتے ہیں
کوئی سراب لگتے ہیں
عذابِ زیست کا وہ جو
کوئی نصاب
لگتے ہیں
یہی تو سوچ رکھا تھا
یہی تھا طے کیا ہم نے
وہ کاغذ
پھاڑ کر سارے
اُنہیں آخر جلانا تھا
اُسے تو بھول جانا تھا
اُسے پھر
یاد کیوں رکھا
ازل سے میں اکیلا تھا
ازل سے ہی میں تنہا تھا

کسی کی آنکھ کا شاید

وہ تارا تھا

وہ سپنا تھا

نہ کوئی اُس سے تعلق تھا

نہ کوئی رشتہ پرانا تھا

کوئی آغاز بھی ہوتا

یہی انجام پانا تھا

اگر وہ مل بھی جاتا پھر

اُسے آخر گنوانا تھا

اُسے تو بھول جانا تھا

اُسے پھر

یاد کیوں رکھا

ہزاروں فاصلے تھے اور

کوئی عہدِ وفا نہ تھا

کسی بھی ربط کا اُس سے

کوئی بھی

سلسلہ نہ تھا

کبھی وہ رُوٹھ بھی جاتا

اُسے کیونکر منانا تھا

اُسے جاتے ہوئے بھی تو

کوئی آواز دینی تھی

نہ پھر واپس بلانا تھا

اُسے تو بھول جانا تھا

اُسے پھر

یاد کیوں رکھا۔۔

☆

میرے ذہن میں جو نقش تھا اُسے عمر بھر نہ مٹا سکا
نہ نصیب تھیں مجھے چاہتیں نہ کسی کے دل میں سما سکا

یہ ازل سے میرا نصیب تھا اِنہی گردشوں کے طواف میں
جو ملا اُسے بھی گنوا دِیا نہ کسی کو دل سے بھلا سکا

اِک بار دل سے گیا تو پھر وہی اعتماد نہ رہا کبھی
نہ سمٹ سکے کبھی فاصلے نہ ہی پاس چل کے وہ آ سکا

یہ شہر کتنا عجیب ہے کسی بھیڑ میں کسی موڑ پر
اِک ہی نگر کے ہیں راستے کوئی راستہ نہ ملا سکا

نہ ملیں کبھی اُسے فرصتیں نہ خیال تھا نہ قیاس تھا
نہ کسی کو میری خبر ہوئی نہ کسی کو کچھ میں بتا سکا

بڑے ساتھ تھے میرے ہم سفر کسی ہم سفر پہ گلہ نہیں
مجھے جس کی تھی بڑی آرزو وہی دوستی نہ نبھا سکا

☆

ایام نحس کو گھر میں ٹھہر کے دیکھتے تھے
وہ کون تھے جو ستارے سفر کے دیکھتے تھے

مری طرح سے وہ صدیوں چلے ہوئے ہوں گے
جو لوگ دشت میں سائے شجر کے دیکھتے تھے

اب اِس دیار سے روحیں بھی کر گئیں ہجرت
وہ کچھ بزرگ سنا ہے کہ مر کے دیکھتے تھے

عجب مکیں تھے کہ خود ہی جلا کے بستی کو
پھر اُس کے بعد پلٹ کر وہ گھر کو دیکھتے تھے

نہ بستیاں نہ پہاڑوں میں راستے نہ کہیں
وہ قافلے جو سرِ راہ اُتر کے دیکھتے تھے

یہاں ضرور کوئی حادثہ ہوا ہے عقیلؔ
کہ اِس جگہ کو پرندے بھی ڈر کے دیکھتے تھے



نظر ملانا نظر چرانا وہ روٹھ جانا بھی یاد آیا
سہم سہم کر تمہارا چھت سے مجھے بلانا بھی یاد آیا

کبھی جو ملنا تو ایسے ملنا کہ بات کرنا تو روتے رہنا
عجیب لہجے میں تیرا مجھ کو وہ غم سنانا بھی یاد آیا

ہے یاد مجھ کو وقتِ رُخصت مرے وہ چہرے سے آخری شب
وہ جاتے جاتے ہوئے یوں تیرا نظر ہٹانا بھی یاد آیا

پھر آج اُٹھا میں دِن گئے تو خیال آیا ہے اُن دنوں کا
وہ گھر میں تیرا صبح سویرے مجھے جگانا بھی یاد آیا

کوئی نہ آیا جو عید ملنے تو سُونے گھر کی اُداسیوں میں
وہ چاند راتوں کو تیرا آ کر مجھے منانا بھی یاد آیا

عجیب طرح کے فاصلے تھے وہ پاس رہ کے بھی دُوریاں کچھ
وہ پہلے پہلے جو تیرا ملنا تو کچھ چھپانا بھی یاد آیا



اب ترا ہم سفر بھی رہنا ہے اور بچھڑنے کا ڈر بھی رہنا ہے
تیری دنیا میں ہم فقیروں نے اِس قدر معتبر بھی رہنا ہے

یہ ہے شرطِ سفر کہ کرنے ہیں ہم نے صدیوں کے راستے بھی طے
اور سرِ راہ ہر مسافت میں قید خود اپنے گھر بھی رہنا ہے

اب تمہیں بھولنا بھی ہم نے اور تری جستجو بھی رکھنی ہے
ایک دیوار بھی اُٹھانی ہے اور کوئی اُس میں در بھی رہنا ہے

ایک تھا سانحہ محبت کا جو ہوا تھا کسی زمانے میں
غم تو یہ ہے کہ عمر بھر مجھ پہ اب اُسی کا اثر بھی رہنا ہے

یہ بکھرنے کی شرط کیسی ہے تیری دینا میں ہی تری خاطر
خود کو میں نے سمیٹنا بھی ہے اور صدا در بدر بھی رہنا ہے

اُس کو کھو کر گزارنے ہیں عقیلؔ ایک لمحے میں عمر بھر کے سفر
پھر اُسی جستجو کی ساعت میں ہر سفر مختصر بھی رہنا ہے

سنو جاناں

سنو جاناں
ابھی ہم ساتھ ہیں لیکن
کبھی ہم کو بچھڑنا ہے
بچھڑنا ہے تو ایسے کہ
بھرے اِس شہر کے اندر
نہ میں نے تم سے ملنا ہے
نہ تم نے مجھ سے ملنا ہے
یہ جگہ جس جگہ ہم ہیں
یہاں پھر ہم نہیں ہوں گے
کئی موسم نئے ہوں گے
کئی قصے نئے ہوں گے
مگر دوہرائے گا یہ وقت
پرانی اَن کہی باتیں
وجہ تم نہیں ہوں گے
وجہ ہم نہیں ہوں گے

ہمیں سے دُوسرے ہوں گے
نئے کچھ لوگ وہ ہوں گے
مگر وہ لفظ یہی ہوں گے
سنو جاناں
ابھی ہم ساتھ ہیں لیکن
کبھی ہم کو بچھڑنا ہے۔۔

چلو پھر لوٹ جاتے ھیں

صدائیں سو گئیں تھک کر

شہر خاموش ہے جیسے
صدائیں سو گئیں تھک کر
مسافر جا چکے سارے
دریچے اپنی آنکھیں بند کیے
اَب سو گئے سارے
گھروں سے جھانکنے والے
بھی پتھر ہو گئے سارے
خاموشی اتنی گہری ہے
کہیں خاموش پیڑوں پر
پرندے پھڑ پھڑائیں تو
صدا اُن کی نہیں آتی
یہاں پیڑوں کے پتوں تک
ہوا اَب کے نہیں آتی
دیواریں اتنی اُونچی ہیں
یہاں کے رہنے والوں کی

یہاں سے دِن گزر جائے
کوئی گھُٹ گھُٹ کے مر جائے
کوئی بھوکا مسافر بھی
کسی در پہ ٹھہر جائے
خبر کچھ بھی نہیں ہوتی
خبر گر ہو بھی جائے تو
اثر کچھ بھی نہیں ہوتا
یہ سنگ و آہن کی بستی
یہاں کے قید خانوں میں
کوئی مانگے تو کیا مانگے
کوئی چاہے تو کیا چاہے
شہر خاموش ہے جیسے
صدائیں سو گئیں تھک کر۔۔

وقتِ رخصت

میں کیسے لکھوں
جو وقتِ رخصت
کسی کی آنکھوں سے پڑھ لیا تھا
کسی نے رُک کر
اُداس لہجے میں
جو پیام اِک مجھے دیا تھا
میں لکھ تو لوں پر
میں کیسے لکھوں
وہ لفظ سارے کہاں سے لاؤں
جو وقتِ رخصت
وہ لے گیا ہے
مجھے وہ اتنا ہی کہہ گیا ہے
تو لکھ تو لے گا
مگر نہ لکھتا
اُداسیوں کے یہ سارے موسم

اگر لکھو گے تو یاد رکھنا
کہ لکھتے لکھتے
تمہارے ہاتھوں کی اُنگلیوں سے
یہ سارا خوں جب نچڑ گیا تو
مجھے بتاؤ
کہ زخمی پوروں
سے کیا لکھو گے
کہ صدیوں لکھتے رہو گے لیکن
یہ ایک لمحہ رقم نہ ہو گا
مجھے لکھا تو فقط یہ لکھنا
وہ آخری شب کا اِک مُسافر
گزرتے لمحوں پہ چلتے چلتے
نظر سے
اوجھل سا ہو گیا ہے
مگر جو کچھ اور لکھنا چاہو
تو کچھ نہ لکھنا
فقط یہ لکھنا

میں کیسے لکھوں
جو وقتِ رُخصت
کسی کی آنکھوں سے پڑھ لیا تھا

تم سے اتنا ہی صرف کہنا تھا

اِس سے پہلے کہ لفظ کھو جائیں
ستارے قسمت کے
سارے سو جائیں
اِس بھرے شہر کے اندر
ہم بھی تم سے
جُدا نہ ہو جائیں
دِل میں کوئی خیال ہو نہ کل
لب پہ کوئی سوال ہو نہ کل
اِس سے پہلے
کہ وقت کھو جائے
تو کسی اور کا نہ ہو جائے
چلو پھر آج تم سے کہہ ڈالوں
وہ سبھی دِل کی اَن کہی باتیں
سن کے بھی ہیں جو اَن سُنی باتیں
تم سے اتنا ہی صِرف کہنا تھا

مجھ کو تم سے
بہت محبت ہے

خیالِ ماضی

اکثر سوچتا ہوں میں
تیرے ہونٹوں کی وہ باتیں
تیری وہ
دِل نشیں آنکھیں
سارے تیرے پیار کے لمحے
تیری آہٹ تیری یادیں
میں اکثر سوچتا ہوں کہ
یہ پل کیسے بتاؤں گا
کسے اپنا بناؤں گا
تمہیں کیسے بھلاؤں گا



اُداس لمحوں کے سلسلے تھے
خیالِ رفتہ میں تم ملے تھے

تمہارے شہرِ جنوں کے شب بھر
ویران رستے پکارتے تھے

میں چن رہا ہوں وہ ریزہ ریزہ
جو خواب سارے بکھر گئے تھے

گلی کے پتھر وہ سوکھے پتے
تمہارے بارے میں پوچھتے تھے

ہجومِ دُنیا میں کھو گئے ہیں
وہ میرا رستہ جو دیکھتے تھے

تمہارے میرے وہ درمیاں کچھ
طویل صدیوں کے فاصلے تھے

بہت سے لوگوں کی طرح ہم بھی
تمہاری آنکھوں پہ مر مٹے تھے

اُنھیں تو صحرا نگل گیا ہے
گئی رُتوں میں جو قافلے تھے

عقیلؔ گھر میں کوئی نہیں ہے
تم آدھی شب میں کہاں گئے تھے



یونہی بے سبب ترے شہر سے جو گزر گیا تو اُداس ہوں
یہ بھی دِن مسافتِ آرزو میں اُتر گیا تو اُداس ہوں

اُسے خیر کس کا خیال تھا اُسے اِک نظر سے گریز ہے
اُسے دیکھ کر سرِ رہ گزر میں ٹھہر گیا تو اُداس ہوں

یہی سالِ نو کی اذیتیں تمہیں کیا بتاؤں کہ کیا ہوئیں
تھے جو آشنا اُنہی دوستوں سے بچھڑ گیا تو اُداس ہوں

میں چلا تھا راحتیں ڈھونڈنے کبھی خوشبوؤں کی تلاش تھی
کسی ریگزار کے شہر میں یوں بکھر گیا تو اُداس ہوں

یوں ہی بے وجہ سے خیال ہیں کبھی اُلجھنیں کبھی وحشتیں
مجھے کیا ہوا بڑی دیر سے جو میں گھر گیا تو اُداس ہوں

اِک داستاں تھی گزر گئی کوئی شخص تھا میری داستاں
ابھی دِن گئے یہ ملی خبر وہی مر گیا تو اُداس ہوں

کوئی یاد آیا تو اب عقیلؔ وہ صدائیں پھر سے سنائی دیں
اِک سال گزرا ہے اِس طرح میں سنور گیا تو اُداس ہوں

میں نے تم سے پھر نہیں ملنا

وقتِ رُخصت اُس نے کہا تھا
میرا ہر پل ساتھ نبھانا
دیکھو مجھ کو بھول نہ جانا
میں نے تم کو آزمایا تھا
اَب تم خود کو نہ آزمانہ
جیسے بھی حالات ہوں لیکن
جینا تو لازم ہوتا ہے
میں نے تم سے یہ کہنا تھا
جینا ہے
بس بھول نہ جانا
جس کو چاہت ہم کہتے ہیں
اس کا اتنا سا ہے فسانہ
پہلے ہم تنہا رہتے تھے
اور یہ ملنے کا تھا بہانا
لاحاصل یہ سفر تھا جس میں

منزل کا کچھ پاس نہیں تھا
کوئی دکھ بھی ساتھ نہیں تھا
لیکن ایسا بھی ہوتا ہے
قسمت کا یہ بھی لکھا تھا
ظالم اِس سنسار میں آخر
ہم نے تم کو بھی کھونا تھا
جیسے ہم تنہا تھے پہلے
ویسے پھر تنہا رہنا تھا
دیکھو کیسا وقت ہے آیا
جس کے ہر پل پاس رہا ہوں
لمحہ لمحہ ساتھ رہا ہوں
آج یہ اُس سے بھی کہنا تھا
میں نے تم سے
پھر نہیں ملنا

دستک

آج پھر کتنی اُداسی تھی کسی شام کے بعد
آج پھر شب کے سناٹوں میں
ویراں رستوں پر
پھر کوئی یاد جو آئی
تو یوں رفتہ رفتہ
بہہ گئے آنکھ سے آنسو بھی نجانے کتنے
اُنہی یادوں کے تعاقب میں
یوں چلتے چلتے
میں کسی زیست کے موسم میں ملا ہوں اُس سے
رُک گئے راہ میں وہ بیتے ہوئے لمحے شاید
لوٹ کر آ گئے چاہت کے خزاں سالوں میں
وہ تیری سوچ کے عذاب دوبارہ شاید
دِل کے خستہ سے مکانوں میں

کسی نے آ کر

مدتوں بعد بڑی دیر

یوں دستک دی ہے

احتسابِ زندگی

بارشوں کے موسم میں
خزاں کی سرد راتوں میں
بھیگی بھیگی مٹی کی
ہلکی ہلکی خوشبو میں
کاغذوں کے مانند پھر
پاؤں کے تلے آ کر
کچلے جانے والے سب
گیلے بکھرے پتوں میں
وقت کے سرابوں میں
زیست کے نصابوں میں
بیتے سارے لمحوں کی
اُن سبھی کتابوں میں
اَن لکھی کہانی کی
اَن لکھے فسانوں میں

مٹنے والے صفحوں میں
اِن ادھورے لفظوں میں
اِس اُداس جیون کی
احتسابِ زندگی کے
اُلجھے سب سوالوں میں
زندگی کی ڈائری میں
اُس کے نام سے لکھے
وقت کے حوالوں میں
جانے کن خیالوں میں
شہر کی اُداسی میں
رات بھر سناٹوں میں
اُس سے بچھڑے رستوں پر
آرزو لیے اُس کی
دِل کا سفر جاری ہے

☆

خطوں میں لکھے ہوئے فسانے گئی رُتوں کا پیام دیں گے
تمہیں یہ گزرے ہوئے زمانے گئی رُتوں کا پیام دیں گے

بدلتے موسم صدائیں دے کر گزر گئے جب نظر اُٹھانا
وہ پہلی چڑیوں کے آشیانے گئی رُتوں کا پیام دیں گے

جہاں جہاں سے یہ قافلہ اِک گزر کے آیا رفاقتوں کا
اُجاڑ رستے وہ سب ٹھکانے گئی رُتوں کا پیام دیں گے

یقین ہے مجھ کو ایک دِن تو اُداس پیڑوں کے سلسلوں پر
وہ نام لکھے ہوئے پُرانے گئی رُتوں کا پیام دیں گے

کوئی گلی ہو کسی کا در ہو عقیلؔ وحشت ملے گی تم کو
ہماری بستی کے سب گھرانے گئی رتوں کا پیام دیں گے

انتظار

تم سے مل کر
یہ سوچتا ہوں میں
تم سے ملنا تو
پل دو پل کا تھا
لفظ کتنے میرے گماں میں تھے
جن کو کہنے کی نہ ملی مہلت
زندگی جس قدر بھی مہلت دے
تم سے ملنا
تو پل دو پل کا تھا
انتظار ہے کہ عمر بھر کا ہے

تلاش

وحشتِ شام تری یاد
اداسی کے سفر
لوحِ محفوظ پہ ٹھہرے ہوئے
لفظوں کے نقوش
کوہِ ہجراں میں بھٹکتی ہوئی
روحوں کے طواف
بامِ ادراک پہ مایوسی کے
گھیرے سائے
کُو بکُو پھرتی ہوئی آس
بھٹکتے ارماں
وادیٔ زیست میں گُم گشتہ
مری ہستی کے نشاں
درِ ادراک سے لوٹ آئے ہوئے
خرد کے دُکھ

شہرِ افکار میں گزرے ہوئے
لوگوں کی صدا
عالمِ سوچ میں لوگوں کے
خیالی چہرے
یادِ ماضی سے تراشے ہوئے
لفظوں کے بدن
دربدر پھرتے تخیّل کا
یہی حاصل ہے
میں تری ذات میں کھو کر
نئے سفر میں ہوں

نہ وہ جھولے نہ کہیں ہم جولیوں کے سلسلے
اب کہاں چوپال پہ وہ بولیوں کے سلسلے

گاؤں کے کچے سے رستوں پہ وہ شہنائیوں کے سُر
ناچ کر گاتے براتی ڈولیوں کے سلسلے

روئی کو چنتی ہوئیں وہ مرمریں سی لڑکیاں
کھیت میں پھیلے ہوئے سب ٹولیوں کے سلسلے

رات بھر گاؤں میں روشن شب براتوں کے چراغ
مندروں کے سامنے تھے ہولیوں کے سلسلے

چھین کر ہی لے گیا یہ دور ساری رونقیں
اب دھواں بارود ہے گولیوں کے سلسلے

خواب ہو کر رہ گئیں وہ چاندنی راتیں عقیل
جگنوؤں سے بھر لیے تھے جھولیوں کے سلسلے

فکرِ انساں سے کہیں آگے جہاں زندہ ہے
کیسے انساں کو خبر ہو وہ کہاں زندہ ہے

جل چکا ہے کوئی اک شہر پسِ عالمِ زیست
راکھ کے ساتھ ہواؤں میں دھواں زندہ ہے

جسم میں قید ہیں چند سانسیں تو اُس پہ ٹھہری
ایک اَن دیکھی سی بنیادِ مکاں زندہ ہے

مٹ چکے ہیں سبھی عنوان کہ تحریر کے ساتھ
ایک گم نام مصنف کا نشاں زندہ ہے

تجھ کو جینے کی تڑپ ہے تو بھٹکنے والے
دیکھ وہ کون سرِ نوکِ سناں زندہ ہے

ہر کوئی اپنے ہی لاشے کو ہے دفنائے ہوئے
دیکھنا یہ ہے کہ اب کون یہاں زندہ ہے

نہ خریدار نہ بازار کی رونق نہ ہجوم
جانے کس آس پہ خوابوں کی دکاں زندہ ہے

اب تو انساں نہیں عالمِ ہستی میں عقیلؔ
سانس لیتا ہوا اک کوہِ گراں زندہ ہے



اک عالمِ ارواح سے دھکیلا ہوا میں ہوں
اِس واسطے اِس دہر میں تنہا ہوا میں ہوں

صدیوں سے ہے اک دشتِ اذیت کی مسافت
مدت سے سرِ راہ جھلستا ہوا میں ہوں

اے وقت کی رفتار ذرا ٹھہر مجھے دیکھ
کس طرح ترے پاؤں میں رکھا ہوا میں ہوں

جائے تو کوئی جا کے ہوا کو یہ خبر دے
اک خواب کی دہلیز پہ جلتا ہوا میں ہوں

ہر سمت سناٹا ہے فلک سے یہ خلا تک
ہے دُور زمیں بیچ میں گِرا ہوا میں ہوں

اب راکھ میں ڈھل جانے کے اثار بہت ہیں
احساس کی حدت سے پگھلتا ہوا میں ہوں

اک حدِ نظر پھیلا ہوا دشت ہے مجھ میں
اور اُس کے سرابوں میں بھٹکتا ہوا میں ہوں

اے کوہِ گراں پھر مجھے لوٹا دے کسی سمت
پھر تیرے حصاروں سے نکلتا ہوا میں ہوں

ہر وقت کوئی مجھ پہ اذیت ہے عقیلؔ اب
ہر سانس کی دہلیز پہ مرتا ہوا میں ہوں



رات سایہ سا کوئی شہرِ اماں سے نکلا
سسکیاں لیتے ہوئے کون مکاں سے نکلا

جل بجھا مجھ میں کوئی شہر تو اِک رت پہلے
اب دھواں اٹھتا ہوا جانے کہاں سے نکلا

در بدر پھرتا ہوں اب عالمِ ارواح میں کہیں
میں ترے ذہن سے نکلا تو جہاں سے نکلا

تُو جہاں سوچ رہا تھا میں وہیں جا ڈوبا
تُو جہاں دیکھ نہ پایا میں وہاں سے نکلا

آئینہ ٹوٹا تو پھر بانٹ دیا اُس نے مجھے
میں وہاں کب تھا مرا عکس جہاں سے نکلا

ایک تکرار ہوا شہرِ مقافات میں تھا
میں تو بے جرم درِ شہرِ اماں سے نکلا

اک اذیت کا سفر ختم ہوا جب بھی عقیلؔ
سلسلہ پھر سے نئے کوہِ گراں سے نکلا



ہوا کی زد میں جو آ گئے تھے وہ آشیانے بکھرتے دیکھے
کہیں پہ اوراق ریزہ ریزہ کہیں پہ الفاظ مرتے دیکھے

یوں رازِ ہستی سمجھ میں آیا فسانۂ جاں کا سلسلہ بھی
اداس پیڑوں کی ٹہنیوں سے خزاں میں پتے بچھڑے دیکھے

تمہارا میرا تو سلسلہ اب ذرا سی مدت کا سلسلہ ہے
وہ لوگ کیسے تھے جو محبت میں حد سے آگے گزرتے دیکھے

گزار دو ضبط کی سلیبوں پہ شدتِ غم کی تلخیوں کو
یہ زخم کیا وقت کے سہاروں پہ سوکھ دریا بھی بھرتے دیکھے

یہ قسمتوں کا فتور ہے جو ازل سے ٹھہرا ہوا ہے اب تک
ہیں سبزہ زاروں میں پیڑ ایسے کہ جن سے پنچھی بھی ڈرتے دیکھے

ترے بدلنے پہ کیا گلہ جب مجھے کبھی تم ملے نہیں ہو
میں نے سرِ دھوپ راہ میں اکثر بدن سے سائے بچھڑتے دیکھے

خدا کرے خیر ہو عقیلؔ اب میں جاگ بیٹھا ہوں جس سے ڈر کر
وہ خواب کیا تھا کہ آپ کی زد میں شہر سارے ہی جلتے دیکھے

صلیبِ زیست

وہ بھی لوگ کیسے تھے لوگ جو
رُخِ زندگی کی صلیب پر
ہر وقت لیتے تھے سسکیاں
جنہیں بوجھ لگتی تھی زندگی
جنہیں موت کی تھی امید بس
رُخِ زندگی کی صلیب پر
یہ بھی دیکھا اکثر ہے معجزہ
وہی لوگ صدیوں کھڑے رہے
نہ مرے نہ زندہ رہے کبھی۔۔

یہ اُسکی قسمت

ٹھٹھرتی سردی کی ایک شب میں
وہ اپنی چادر کی چھت بنائے
بوسیدہ کپڑوں کی پتلی تہہ سے
وہ کانپتے جسم کو چھپائے
سمٹ کے بیٹھی تھی خود سے لگ کر
کسی کی بیٹی
کسی کی ممتا
شہر کی ویران اِک گلی میں
اکیلی تنہا سمٹ کے بیٹھی
کیوں سرد جھونکوں کے اَب تھپڑوں کو جھیلتی ہے

وہ کس سزا میں یوں جاگتی ہے
مجھے بتاؤ
میں کب سے بیٹھا یہ سوچتا ہوں
وہ بھی تو عورت ہے اور عورت
کیا جائیدادوں کی حصہ داری سے کٹ گئی تو
جہاں بھی جائے جدھر بھی بیٹھے
یہ اُس کی قسمت

محبت مٹ گئی میری

تمہیں کیسے بتاؤں کہ
محبت مٹ گئی میری
وہ سارے قافلے دِل سے
گزر کر ہو گئے مٹی
مٹا ڈالے وہ نقشِ پا ہواؤں نے سبھی آخر
چلو یہ آرزو تھک کر کہیں پر تو رُکی آخر
مگر پھر بھی کئی یادیں ہیں
جو اَب تک بھٹکتی ہیں
سُنا ہے تتلیاں اَب بھی تمہارا ذکر کرتی ہیں
مگر صرف فرق اِتنا ہے
جہاں تم تھے کسی رُت میں
وہاں اَب تم نہیں ہوتے
تمہاری راہ میں لیکن کہیں بھی ہم نہیں ہوتے
تو ہے گر اجنبی تو پھر
تمہارا کیا بھروسا تھا

نہیں ہے تو تیرا پھر کس لیے ہم تذکرہ رکھتے
تمہارے واسطے گھر اپنا کیونکر پھر کھلا رکھتے

ہزاروں راستے ایسے
جو باہم ہو نہیں سکتے
کچھ ایسے حادثے ہیں جو کبھی کم ہو نہیں سکتے
کسی کو چھوڑ دینے سے کوئی مر تو نہیں جاتا
کسی کو چھوڑ دینے سے مگر کچھ غم تو ہوتا ہے
تو نے برسوں کے بعد آ کر
ابھی جو مجھ سے پوچھا ہے
صدائیں جو بھی تھیں دِل میں
میں نے اُن کو دبا ڈالا
تمہیں دِل سے بھلا ڈالا

تحریریں

بہت سادہ سے کاغذ پر
بہت سادہ سی تحریریں
کبھی تیرا نام لکھ دینا
کوئی پیغام لکھ دینا
کوئی پیغام لکھ کر پھر
اُسی کو چومتے رہنا
اُسے پھر چوم کر یوں ہی
ذرا سا خون لے کر پھر
کسی کونے لگا دینا
کبھی خوشبو لگا دینا
کبھی روتے ہوئے لکھنا
اِنہی بے چین آنکھوں سے
اُسی کاغذ کی اِک جانب
کبھی آنسو گرا دینا
کسی پھر قلم کو لے کر

اِنہی اشکوں کی اِک جانب
کوئی چہرہ بنا دینا
وہی آنکھیں بنا دینا
کبھی اُن زیست کے لمحوں کے
اِک اِک وقت کو لکھنا
کبھی تاریخ لکھ دینا
کبھی لکھ کر مٹا دینا
کبھی سوکھے سے پتوں کو
بھی کاغذ پر لگا دینا
ذرا ذرا سی باتوں پہ
کئی قصے سنا دینا
اشاروں سے وہ کچھ لکھنا
اشاروں سے وہ کچھ کہنا
کبھی سب کچھ چھپا لینا
کبھی سب کچھ بتا دینا
پھر آخر فیصلہ کرنا
ذرا سا حوصلہ کرنا

وہ کاغذ پھاڑ دینا
یا اُسی سادہ سے کاغذ کو
کبھی پڑھ کر جلا دینا

قیمت

دیکھتے ہیں
کیا قیمت لگائی ہے تمہاری
ظالم اِن دنیاداروں نے
جذبوں کے اِن خریداروں نے
بس صرف
حسن کے پرستاروں نے
تیرے سچے حسن کے بدلے
اپنی میلی دولت دے کر
رِسنے والے ناسُوروں نے
قصرِ خاک کے مزدوروں نے
تھوڑی سی کچھ
ریت کے بدلے
تاج محل کو پا لینے کی
کیا ترکیب نکالی ہے اَب
کس طرح سے گرد نے اُڑ کر

چاند کو میلا کر دینے کا
اَب کے پکا عہد کیا ہے
دیکھتے ہیں کاغذ کے ٹکڑے
تانبے چاندی کے چند سکے
لالچ کی میزان کے اوپر
دولت کے ایمان کے اوپر
اِس گوہرِ انمول کو آخر
حرص و ہوس کے اس پلڑے سے
کس طرح مٹی کرتے ہیں

پنجاب کالج کی بس

پنجاب کالج کی ایک بس میں
وہ سامنے والی کھڑکیوں سے
کوئی حسینہ تھی جھانکتی تھی
عجیب صورت سی اک بنا کے
وہ رُخ سے زلفیں ذرا ہٹا کے
وہ اپنی آنکھیں بھی کچھ چھپا کے
نظر ملا کر گزرتی جاتی
پنجاب کالج کی بس میں وہ بھی
شہر کی سڑکوں میں ایک دم سے
کہیں اچانک سے کھو سی جاتی
یہ روز شب کا ہی سلسلہ تھا
عجیب سا اِک جنون جیسے
کہ عشق کا ہو
کسی نے روح میں اُتر کے جیسے
کوئی سحر مجھ پہ کر دیا ہو

میں اُس کے رستوں میں رُک سا جاتا
بہانے کر کے عجیب سے کچھ
کبھی تو لوگوں سے بات کر کے
میں چلتا بھی تو ٹھہر ٹھہر کے
میں راستے تکتا تھا وہ شہر کے
جہاں آتی تھی بس گزر کے
کبھی تو بس کو بھی رُکنا پڑتا
کبھی جو سڑکوں پہ بھیڑ ہوتی
تو کچے رستوں پہ مڑنا پڑتا
سہم سہم کر گزرنا پڑتا
تو بس کے ٹائرز کی اس رگڑ سے
زمیں سے گرد و غبار ساری
وہ دھند کی مانند جو بادلوں سی
ہوا میں اڑتی تو بس کی کھڑکی
وہ اپنے ہاتھوں سے بند کرتی
تو ایسا لگتا
کہ چاند جیسے کہ بادلوں میں اتر گیا ہو

کہیں سے جھونکا گزر گیا ہو
ادائیں اُس کی عجیب تر تھیں
وہ لڑکی خود میں بھی معتبر تھی
بہت ہی سادا تھی وہ نڈر تھی
وہ میری حالت سے باخبر تھی
کبھی جو رُکتی وہ بس کہیں پر
تو اس کے تیور میں فرق پڑتے
کبھی جو پڑھتی تو لکھنے لگتی
کہیں پہ لکھتی تو پڑھنے لگتی
کتابیں اپنی دِکھا کے مجھ کو
توجہ مجھ سے ہٹانے لگتی
وہ جان جیسے چھڑانے لگتی
ذرا سا غصہ دیکھانے لگتی
میں رُکتے رُکتے بھی چلنے لگتا
نگاہیں اپنی بدلنے لگتا
میں دِل ہی دِل میں تو جلنے لگتا
تو بھانپ لیتی وہ میری حالت

عجیب تر تھی یہ اُس کی عادت
وہ اپنی نظروں کو پھر اُٹھاتی
خاموش لہجے میں مسکراتی
مجھے وہ تھوڑا سا آزماتی
عجیب صورت سی اِک بنا کے
وہ رُخ سے زلفیں ذرا ہٹا کے
وہ اپنی آنکھیں بھی کچھ چھپا کے
نظر ملا کر گزرتی جاتی
پنجاب کالج کی بس میں وہ بھی
شہر کی سڑکوں میں ایک دم سے
کہیں اچانک سے
کھو سی جاتی



اُسے گنوا کر تلاش کرنا عجیب عادت بنا رکھی ہے
سراب رستوں پہ ایسے چلنا عجیب عادت بنا رکھی ہے

گزشتہ لوگوں کا ذکر لے کر کہیں خیالوں میں لفظ چننا
اُداس لمحوں میں رنگ بھرنا عجیب عادت بنا رکھی ہے

یہ آسرے کچھ بنا کے رکھنا ذراذرا سی رفاقتوں کے
گماں کی ڈوری سے خواب بُنتا عجیب عادت بنا رکھی ہے

کتابیں لکھنا محبتوں کی کسی کو لکھنا چھپا چھپا کے
کوئی جو پوچھے تو پھر مکرنا عجیب عادت بنا رکھی ہے

یہ کیا ہوا کہ بچھڑ کے اُس سے میں اَب کے خود سے خفا خفا ہوں
کوئی بھی رُت ہو اُداس پھرنا عجیب عادت بنا رکھی ہے

کسی کو پہلی ہی فرصتوں میں طویل چاہت کی آرزو تھی
مگر کسی نے خفا سا ملنا عجیب عادت بنا رکھی ہے

شکستہ پتوں کے گھر بنانا مٹانا پیڑوں سے نام جا کر
گلاب پیروں تلے مسلنا عجیب عادت بنا رکھی ہے

میں اپنے حصے کی روشنی ہوں نشان ہوں اپنی منزلوں کا
یہ کون سمجھے کہ میں نے جلنا عجیب عادت بنا رکھی ہے



اُداسیوں کے سفر پہ نکلے تو گردِ راہ ہی اُٹھا کے لائے
ہم اہلِ دِل بھی وفا کی چاہ میں یہ کیسی حالت بنا کے لائے

جہاں پہ زندگی شکستہ لمحوں کے آسروں پر کھڑی ہوئی ہے
ہم اپنی آنکھوں کو وحشتوں کے وہ سلسلے بھی دِکھا کے لائے

تمہارے لہجے کی کپکپاہٹ تمہاری نظروں کے چند سہارے
کہیں کہیں سے تو خوابِ جاں کو تیرے وسیلے بچا کے لائے

یہی صلہ ہے محبتوں کا کہ تذکرے میں رفاقتوں کے
یہ لوگ بدلے میں کاغذوں پر میرا نشاں تک مٹا کے لائے

تم روز مجھ سے یہ پوچھتے تھے کہ شاعری کا ہے یہ سبب کیا
تمہیں بتاؤں یہ ساری غزلیں بہت سی دولت گنوا کے لائے

نکل پڑے تھے تو جیسے رُک کر زمانہ سارا یہ دیکھتا تھا
کہیں سے پلٹے تو آنکھ نم تھی کسی کا غم تھا چھپا کے لائے

کچھ اشعار

اتنا ٹوٹا ہوں کہ میلوں میں پڑے ہیں اعضا
مجھ کو چننا ہے تو صدیوں کا سفر کر تُو بھی



زندگی پھر سے اگر مجھ کو عطا کرنی ہے
میری آنکھوں میں کوئی خواب نہ رکھنا یا رب



تیری آنکھوں میں اُترنے کی جسارت کی تھی
میں اِس جرم کی تا عمر سزا پائی ہے





جب یہ رشتہ نبھا نہیں سکتے
قافلے دُور جا نہیں سکتے

بس یہ غم ہے کہ دامنِ دِل سے
داغ کتنے دکھا نہیں سکتے

بات کہنے کے سو طریقے ہیں
دِل کسی کا دُکھا نہیں سکتے

خواب حسرت ملال پچھتاوے
ہم یہ ملبہ اُٹھا نہیں سکتے

پڑھ کے روتے ہیں رات بھر اکثر
خط بھی تمہارے جلا نہیں سکتے

تم کسے ڈھونڈتے ہو راہوں میں
وہ مسافر تو آ نہیں سکتے

اَب اُسے بھولنا ضروری ہے
نقش جس کے مٹا نہیں سکتے

اَب تو محو تماشا ہیں ہم بھی
آگ جب سے بجھا نہیں سکتے



بچھڑے ہوئے لوگوں کا یہ ماتم نہ کیا کر
دستورِ زمانہ ہے تو اَب چپ ہی رہا کر

تم اپنی طبیعت سے اُٹھاؤ گے زیاں بھی
اِس شہر کے لوگوں سے زیادہ نہ ملا کر

پیڑوں پہ لکھے حرف پڑھا کر نہ سرِ راہ
اُنگلی سے نہ ساحل پہ کوئی نام لکھا کر

جس شہر کی تعمیر نے کچھ بھی نہ دیا ہو
مل جائے گا کیا اُس کے مکانات گِرا کر

اس شورِ زمانہ سے کہیں دُور بہت دُور
رہتی ہے جو اک دل میں صدا وہ بھی سنا کر

اَب کے یہ دُعا ہے کہ میرے پالنے والے
اِس دورِ مصیبت میں ذرا صبر عطا کر

یہ سال جو گزرا ہے اِسے آخری ساعت
رویا ہوں بہت آج کی شب دِل سے لگا کر

جس حرفِ دعا میں نہیں تاثیرِ عقیلؔ اب
کیوں مانگتا پھرتا ہے اُسے ہاتھ اُٹھا کر



ہم مسافر ہیں بھری شب میں کدھر جائیں گے
شام ہوتے ہی کسی در پہ ٹھہر جائیں گے

کس کو معلوم ہے انجامِ سفر کیا ہو گا
ہم کسی روز مسافت میں ہی مر جائیں گے

اب یہ درویش ترے در پہ صدائیں دے کر
بس ذرا دیر ہی ٹھہریں گے گزر جائیں گے

خوشبو رہ جائے گی کاغذ پہ نشانی کے لئے
اور سبھی حرف کہانی کے بکھر جائیں گے

تم کسی چاند کی دہلیز پہ رکھ لینا قدم
ہم کسی شام اندھیروں میں اُتر جائیں گے

بس یہی رات گزاریں گے تری گلیوں میں
دن جو نکلے تو پھر جانے کدھر جائیں گے

تھک کے گر جائیں گے بے سمت مسافت میں عقیلؔ
یہ پرندے بھی کسی دشت میں مر جائیں گے



بڑی بے سبب ہے یہ زندگی دلگی دِن ہوا کہیں شب ڈھلی
مجھے کیا خبر مجھے کیا پتا ہے یہ کیا سفر یوں گلی گلی

یونہی بے وجہ سی مسافتیں کبھی منزلیں کبھی راستے
وہ سراب سارے خیال سے وہی اُلجھنیں وہی بے بسی

تمہیں یاد ہے وہ طویل شب جو گزر گئی تھی وصال میں
تھی وہ سردیوں کی سرد رُت اور آگ دِل میں لگی ہوئی

میں بھلا یہ کیسے کہوں اُسے میرا ساتھ دے میرے ساتھ چل
ہے وہ آشنا سے نا آشنا اِک میں کہ خود سے بھی اجنبی

میرا ہم سفر ہے ستارا اِک میں جہاں گیا میں جدھر گیا
ہر وقت یونہی گزر گیا میرے سنگ ہے یادوں کی چاندنی

وہ ملا تو لفظوں کے درمیاں کوئی داستاں تھی چھپی ہوئی
وہ گیا تو پھر وہی سلسلے وہی دردِ جاں وہی اَن کہی

ہیں روایتیں بھی عجیب تر اِس شہر میں پہچان کی
کوئی ساتھ ہے تو قدر نہیں جو بچھڑ گیا تو خبر ملی

مجھے اِک بات کہنی ہے

ذرا سی دیر تو ٹھہرو
مجھے اِک بات کہنی ہے
تمہیں معلوم تو ہوگا
تمہارے گرِد لوگوں نے
تمہیں اکثر کہا ہوگا
میری طرح زمانے سے
تو نے شاید سنا ہوگا
آتے جاتے ہوئے کوئی
میری طرح ملا ہوگا
کہیں کچھ تو لکھا ہوگا
کوئی چہرہ پڑھا ہوگا
یہ ممکن ہے کوئی تم کو
نہ مجھ سا جانتا ہوگا
یہ جذبہ بس میرے دِل میں
تیری خاطر بسا ہوگا

مگر یقین ہے مجھ کو
نجانے کیوں یہ لگتا ہے
شہر بھر میں ہر اِک جگہ
تیرا ہی تذکرہ ہوگا
مجھے کچھ بھی نہیں کہنا
فقط اتنا ہی کہنا ہے
قسم لے لو تیری آنکھیں
بڑی ہی خوبصورت ہیں

خواب نگر

کہیں پہ دُور جنگل تھا
بڑا ہی دِل نشیں جنگل
وہاں جنگل میں چھوٹی سی کوئی
جادُو کی نگری تھی
جہاں پریاں سنہری پر لئے
رنگین پیراہن
گلوں کے درمیاں پھرتیں
کبھی بادل اُتر آتے
تو اُن پہ رقص بھی کرتیں
ہزاروں تتلیاں اُڑ کر
اُنہی کے ساتھ ہی چلتیں
وہاں سُورج سنہری تھا
کہ جس کی دھوپ سے کوئی بھی چیز ہو
سونا نظر آتی
وہاں سے امن کی

اور پیار کی ہی بس خبر آتی
ہوا صندل کے پیڑوں کی لیے خوشبو
مہکتی اور سفر کرتی
تو اُس کی دوش پر اُڑ کر پرندے
گیت گاتے
وہاں موجود پیڑوں پہ آ جاتے
مگر اِک دِن
خزاں رُت بھی اُسی جنگل میں آ نکلی
وہاں پہ ناچتی پریوں کو اُس نے
قید میں رکھ کر
گلوں کو بھی مسل ڈالا
ہوا سے چھین کر خوشبو وہاں وحشت ملا ڈالی
گلوں کے سُرخ پیراہن اُتارے
اُنہیں کالے لباسوں میں
جکڑ ڈالا
سنہری دھوپ کو اُس نے
اندھیروں میں بدل ڈالا

وہی نگری کبھی جو امن کا پیغام دیتی تھی
صدائیں چاہتوں کی جو
صبح سے شام دیتی تھی
وہاں کانٹے پنپتے ہیں
سناٹے اپنے پنجوں میں سبھی کو قید رکھتے ہیں
وہاں خوشبو نہیں ہوتی وہاں پریاں نہیں ہوتیں

موبائل میسج

کوئی تو تھا وہ
جو رات کے آخری پلوں میں
نرم سے ہاتھوں سے لفظ لکھ کر
ہوا کی پریوں کے ریشمی سے
سنہری بالوں کی خوشبو لے کر
پروں پہ اُن کے جو لکھتی تھی وہ
وہ لفظ کیا تھے
وہ لفظ کب تھے
کسی کے جذبات کا سفر تھا
وہ اُسکے خوابوں کا لمس تھا جو
مجھے شبوں کی تاریکیوں میں
حسین یادوں کی چاندنی لے کر
کھڑکیوں سے سہم سہم کر
بڑی خاموشی سے رفتہ رفتہ
دبے دبے سے جو پاؤں چل کر

جسم سے کیا رُوح سے بھی گزر کر
ہوا کی پریوں سے پھر اُتر کر
یہ میرے کمرے میں کون آتا
سکوتِ شب کا حصار توڑے
کسی کے خوابوں کی
روشنی اور میرے موبائل پہ
ایک میسج

تمہیں جانا ہی تھا آخر

تمہاری شادی کے اُس دِن
کہ جب تم سُرخ جوڑا پہن کر
گھر سے نکلی تھی
تیرے ہاتھوں پہ مہندی سے
لکھا تھا نام اوروں کا
تیری آنکھوں میں کاجل تھا
کہ سر پہ سُرخ آنچل تھا
کوئی کنگن بھی تھا تیرے ہاتھ میں
کتنا دمکتا تھا
کہ تو اِک چاند تھا جو چودھویں کی شب
چمکتا تھا
چراغاں تھا تیرے گھر میں کہ جیسے آ گئے جگنو
ہوا میں رقص کرتی پھر رہی تھی
دِل نشیں خوشبو

تو چلتی تو تیرے پاؤں تلے آ کر
کئی پتیاں مہکتیں اور تر و تازہ سی ہو جاتیں
کہیں سے تتلیاں اُڑ کر
تیری بانہوں میں سو جاتیں
ہوا چلتی تیرے سر سے کبھی آنچل اُڑا دیتی
کہ شہنائی آوازیں کئی نغمے جگا دیتیں
مگر تم نے تو جانا تھا
تمہیں جانا پڑا آخر
تو نے جاتے ہوئے مجھ کو
ذرا سی دیر دیکھا تھا
نجانے کیا میرے بارے میں
تو نے رُک کے سوچا تھا
کہا جو کچھ مجھے تو نے میں نے کچھ کچھ تو سمجھا تھا
میں کب تک اِک مسافر کا تماشا دیکھتا رہتا
لٹا جو دِل تو کیوں یہ قافلہ میں دیکھتا رہتا
گماں کی ڈوریوں سے جو
میں نے لمحات باندھے تھے

میری اِن جاگتی آنکھوں نے
جو بھی خواب دیکھے تھے
سبھی کچھ سونپ کر اُس کو
میں تنہا آ گیا گھر میں

بہت ہی معتبر ہوں میں

بہت ہی معتبر ہوں میں
بہت مانوس ہیں مجھ سے
پرندے اُس کی نگری کے
مجھے تنہا نہیں کرتے
یہ جگنوں اُس کی بستی کے
ہوائیں پاس سے جاتے ہوئے
اُس کا بتاتی ہیں
کہ خوشبو راہ میں رُک کر
صرف اُس کے تقدس میں
بڑی ہی احتراماً جھک کے چلتی ہے
بہاریں میرے رستوں میں
کبھی ٹھہرا نہیں کرتیں
خزاں رُت میرے پاؤں کے تلے آ کر
بچھا دیتی ہے اِک چادر
شکستہ زرد پتوں کی

گزرتے جا رہے لمحے مجھے بدلا نہیں کرتے
میری آنکھوں سے اَب کے خواب بھی
اُلجھا نہیں سکتے
چلے جاتے ہیں خاموشی سے اَب
نظریں جھکا کے ہم
کسی کو آنکھ بھر کے بھی کبھی دیکھا نہیں کرتے
اُسے سوچا تو کرتے ہیں
اُسے مانگا نہیں کرتے
اُسے مانگا تو کیا ہوگا
اُسے چاہا تو ہے لیکن
اُسے کھویا کیا ہوگا
بہت ہی سوچتا ہوں میں
سکوتِ شب میں تنہائی مجھے آ کر بتاتی ہے
تمہیں اُس کی خواہش نے بڑا انمول کر ڈالا
وہ مل جاتا تو کیا ہوتا
چلو جانے بھی دو
جو پاس ہے رختِ سفر جانو

کہ صدیوں چلتے چلتے بھی یہاں سے کچھ نہ کم ہوگا

یہ جذبہ ایسا جذبہ ہے
جو دُھندلا ہی نہیں سکتا



شام ہوتی ہے تو پھر دِن پہ نظر رکھتے ہیں
ہم پرندے تو یہی رختِ سفر رکھتے ہیں

اپنی فطرت میں نہیں کوئی وراثت جس میں
لوگ صدیوں سے چلے آتے ہیں گھر رکھتے ہیں

کس جگہ پر ہے ہمیں اَب کے میسر روزی
دِن نکلتا ہے تو پھر اِس کی خبر رکھتے ہیں

ڈر کے اُڑتے ہیں جو کھیتوں سے تو سہمے سہمے
ہم بڑی دُور تلک ڈر کے اثر رکھتے ہیں

ایک جھونکے سے جو کانپ اُٹھے کسی شاخ کے ساتھ
گھونسلے ایسے بنانے کا ہنر رکھتے ہیں

ہم تو ہیں دشتِ بیاباں کے ستائے طائر
دُھوپ ملتی ہے جہاں خود کو اُدھر رکھتے ہیں

اپنی قسمت میں نہ منزل ہے نہ گھر ہے عقیلؔ
آنکھ میں بھر کے اداسی کے سفر رکھتے ہیں

دل کے اوراق پہ جاگیر بدل دیتے ہیں
لفظ مٹتے ہیں تو تحریر بدل دیتے ہیں

تم نے دیکھے ہیں کبھی کھیت سرِ راہ جنہیں
راستہ کاٹ کے راہگیر بدل دیتے ہیں

رنگ جذبوں کے بدل جائیں تو پھر رشتوں کی
چند لمحوں میں ہی تصویر بدل دیتے ہیں

بات کرنے کا سلیقہ بھی ہوا کرتا ہے
لفظ عُریاں تو تاثیر بدل دیتے ہیں

یہ میری ماں کی دعاؤں کا اثر ہے کہ حروف
مجھ پہ برسا ہوا ہر تیر بدل دیتے ہیں

اپنے خواب کو چھپا رکھو پسِ ضبط عقیلؔ
لوگ ہر خواب کی تعبیر بدل دیتے ہیں



یہاں کس نے پائی ہیں منزلیں کیوں اُداس ہے میرے دِل بتا
بڑی مختصر سی ہیں چاہتیں کیوں اُداس ہے میرے دِل بتا

ذرا دیکھ تو اِس شہر میں ہر شخص ہے کسی قرب میں
ہیں کسے میسر راحتیں کیوں اُداس ہے میرے دِل بتا

جسے ڈھونڈتا ہے تو جا بجا وہ تو اِک فسانہ سا رہ گئیں
وہ گئے دنوں کی حکایتیں کیوں اُداس ہے میرے دِل بتا

تو نظر ہٹا لے بہار سے کہ وصال کے بھی خیال سے
ذرا سوچ ہجر کی ساعتیں کیوں اُداس ہے میرے دِل بتا

کیوں بھٹک رہا ہے تو کوہِ یاس کی وادیوں میں کہ ہم سفر
ذرا سن یہ کیسی ہیں آہٹیں کیوں اُداس ہے میرے دِل بتا

مجھے کیا ہوا نہ دُعا رہی نہ عباد توں میں خلوص بھی
ہے کہاں وہ پہلی سی رحمتیں کیوں اُداس ہے میرے دِل بتا

جو بچھڑ گیا سو بچھڑ گیا یہ اُصولِ سفرِ حیات ہے
تمہیں کس سے اَب ہیں شکایتیں کیوں اُداس ہے میرے دِل بتا



صراطِ غم پہ عدو نے پوچھا میری اذیت کے سلسلے میں
نشانِ منزل میں کیسے پاؤں تری رفاقت کے سلسلے میں

کہا یہ میں نے مجھے خبر کیا مجھے تو تم سے اُمیدِ غم ہے
ذرا بتاؤ کیا دے سکو گے سوائے نفرت کے سلسلے میں

کہا یہ اُس نے کوئی تو رستہ ہو واپسی کا جہاں سے پلٹوں اماں پاؤں
کوئی نہ پتھر ہو راستے میں تیری محبت کے سلسلے میں

کہا یہ میں نے اِرادے پختہ اگر ہوں تو منزلیں یقیں ہیں
تمہاری عادت ہے راہ بدلنا میری عداوت کے سلسلے میں

کہا یہ اُس نے یہ کیا ہوا کہ تمہارا چہرہ کیوں زرد ہے اَب
میں سچ پوچھو تو بدگماں ہوں تمہاری حالت کے سلسلے میں

کہا یہ میں نے یہ زندگی بھی کہاں سکوں کا پیام لائی
مگر تمہیں کیا میں کیوں بتاؤں کسی مصیبت کے سلسلے میں

کہا یہ اُس نے مصیبتیں بھی ہیں چاہتوں کا عجیب محور
بیاں کرو جو چھپا رہے ہو میری شکایت کے سلسلے میں

کہا یہ میں نے شکایتیں بھی گلے بھی تم سے روا نہیں ہیں
میں ٹال دیتا ہوں بات ہر اِک بس اپنی قسمت کے سلسلے میں

کہا یہ اُس نے میسر آؤں تمہیں اگر تو گزار دو گے
یہ ساری زندگی میرے لئے تم یہاں پہ راحت کے سلسلے میں

کہا یہ میں نے گزار دی ہے تمہاری خواہش کی اِس تھکن میں
مجھے تو اپنی خبر نہیں ہے تمہاری چاہت کے سلسلے میں

کہا یہ اُس نے چلو کہ تجدید پھر کریں ہم اِرادہ کر لیں
چلو کہ زحمتِ سفر تراشیں نئی مُسافت کے سلسلے میں

کہا یہ میں نے بکھر گیا ہوں مجھے سمیٹو نہ راستوں سے
میری مُسافت ہے اِک اُداسی کسی وراثت کے سلسلے میں

کہا یہ اُس نے وراثتیں بھی وبالِ جاں ہیں اذیتیں ہیں
یہ بانٹ ڈالو مجھے ابھی تم یہاں سخاوت کے سلسلے میں

کہا یہ میں نے میں کیسے بانٹوں جو راز دِل میں چھپا لئے ہیں
تمہیں ہمیشہ عدو ہی پایا یہاں حقیقت کے سلسلے میں

اے میری انجان مسافت

شام کی مدھم تاریکی میں
اک ویران سے رستے پر میں
چلتے چلتے سوچ رہا تھا
اے میری انجان مسافت
میں نے تم سے کیا پایا ہے
کیا پایا ہے میں نے تم سے
کس منزل کے سمت چلا ہوں
کس دیوار نے رستہ روکا
کس کی خاطر
تیز ہواؤں کے رُخ موڑے
کس طرح سے
وقت کی شاخ سے لمحے توڑے
کن رستوں پر آتے جاتے
ایک تجسس میں ٹھہرا تھا

کس کس جا پر
تھک کر آخر میں بیٹھا تھا
کن لمحات میں آنکھیں میری پتھرائی تھیں
شام بھی گزری
آدھی شب میں
تم سے میں کچھ پوچھ رہا ہوں
اے میری انجان مسافت
میں نے تم سے کیا پایا ہے

محبت کون سمجھا ہے

محبت ابتدا ہوتے ہوئے بھی اِنتہا ہے
محبت انتہا ہوتے ہوئے بھی ابتدا ہے
محبت کون سمجھا ہے
یہ رشتہ کیسا رشتہ ہے
یہ تعلق ہے تو کیسا ہے
بظاہر ٹوٹ جانے سے مگر یہ عام سا رشتہ
کبھی ٹوٹا نہیں کرتا
کسی کے رُوٹھ جانے سے
کبھی رُوٹھا نہیں کرتا
یہ کس طرح کا تعلق ہے
کسی اِک اجنبی سے جو
کبھی اِک بار ہو جائے
تو پھر موسم بدل جائیں
کئی صدیاں گزر جائیں
ہزاروں خواب مر جائیں یہ اِک سپنا نہیں مرتا

مگر یہ خواب ہے کیسا
کہ جس کی کوئی بھی تعبیر حقیقت ہو نہیں سکتی
حقیقت ہو بھی جائے تو
یہ سپنا مر بھی جائے تو
محبت ابتدا ہوتے ہوئے بھی انتہا ہے
محبت انتہا ہوتے ہوئے بھی ابتدا ہے
محبت کون سمجھا ہے



وہ اُدھورے زیست کے لفظ تھے اُنہیں کیا لکھو گے یہ جان کر
بڑی مختصر سی ہے داستاں اِسے کیا سُنو گے یہ جان کر

کچھ خواب تھے میرے ہم سفر کچھ خواہشوں کا ملال تھا
میرے دِل میں کس کا خیال تھا اَب کیا کرو گے یہ جان کر

وہ گُلاب تیری یاد کے اِن ہی راستوں میں بکھر گئے
سرِ عکس مجھ کو خزاں میں پھر یوں ہی کب ملو گے یہ جان کر

اِک تیرے فراق کا زہر ہی میرے دِل سے رُوح میں اُتر گیا
میں ٹوٹ کر ہوں بکھر گیا مجھے کیا چنو گے یہ جان کر

تھی خاموشیوں کی وہ داستاں جسے کہہ کے لب بھی ہلے نہیں
جسے تم نے سُن کے سُنا نہیں پھر کیا کہو گے یہ جان کر

تیری مُسکراہٹ عزیز تھی کبھی کُچھ بھی تم سے کہا نہیں
میرا کس طرح کا نصیب ہے تم رو پڑو گے یہ جان کر

ہیں طویل تر ہیں مسافتیں شب و روز اِن کے خیال میں
مجھے منزلوں کی خبر نہیں تم کیا چلو گے یہ جان کر